نصرت جبین
اسکالر پی ایچ ڈی اردو ، وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد

آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں انسان دوستی
(تحقیقی و تنقیدی جائزہ)

Nusrat Jabeen
Scholar PhD, Department of Urdu, Federal Urdu University, Islamabad

Humanism in the Poetry of Aftab Iqbal Shamim

Aftab Iqbal Shamim is one of the most important Urdu poets which modern Urdu poem has ever produced. He has six collections of poems to his credit which have been published in a collective form titled as "NADRYAFTA" comprising 1100 pages and more than 300 poems. His creative career is spread over fifty years influenced by different national and international literary and political movements. He has emerged as a great advocator of basic human rights denying every type of tyranny, brutality and cruelty. This article is an effort to research humanistic perspective in his poetry.
Key words: *Modern Urdu poet, human rights, literary and political movements, humanism.*

دنیا کے تمام مذاہب اور فکر و فلسفہ کی تمام تحریکوں نے انسان کو مرکز ٹھہرایا ہے۔ انسان ہی وہ ہستی ہے جس کے گرد دنیا کی تمام تہذیبیں گردش کرتی رہی ہیں۔ دنیا بھر کے مفکروں فلسفیوں اور انقلابیوں نے اپنی تحریروں میں تکریمِ انسانیت، بشریت پسندی، حقوقِ انسانی اور انسان دوستی کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ انسان دوستی لاطینی زبان کے لفظ humanitas[۱] سے ماخوذ ہے۔ یہ فلسفہ تکریمِ انسانیت، عظمتِ بشریت اور فلاحِ بشر کا متقاضی ہے اس لیے آج بھی اس کی اہمیت و افادیت مسلمہ ہے۔ تاریخِ انسانی کا مطالعہ اس بات کا غماز ہے کہ ہر عہد میں انسان دوستی کی حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ادب و فن میں اس اصطلاح کو یورپی احیائے علوم کی تحریک کے آغاز کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ یہ نظریہ ایک تحریک کی صورت میں بھی اسی عہد میں نمایاں ہوا۔ بعد ازاں یہ اصطلاح مذہبی اور سیاسی تعلیمات اور تحریکوں میں بھی مستعمل ہوئی۔ خود ادب بنیادی طور پر بشریت پسند، انسان پسند اور انسان دوست افکار و نظریات کا حامل ہوتا ہے۔ جب کہ شاعر و ادیب انسان دوستی کی خصوصیات کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنا کر ایک مثالی، معاشرتی زندگی کا خواب دیکھتے ہیں۔ یوں انسان دوستی ایک ایسی وسیع المعانی اصطلاح کے طور پر سامنے آتی ہے جس سے فکری سطح پر ادب کی تمام اصناف متاثر ہوتی ہیں۔ عالمی ادب میں

انسان دوستی کے اثرات کا سراغ پانچویں صدی قبل مسیح تک لگایا گیا ہے جس کا براہِ راست اظہار یونانی مفکر پروتاغورس کے اس قول سے ہوتا ہے۔

"انسان کائنات کی تمام اشیاء کا پیمانہ ہے اس بات کا پیمانہ کہ جو اشیاء ہیں وہ اس لیے ہیں کہ وہ ہیں اور جو اشیاء نہیں ہیں وہ اس لیے نہیں ہیں کہ وہ نہیں ہیں۔"[۲]

لیکن ادب اور فن میں اس اصطلاح کو خصوصیت کے ساتھ یورپی احیائے علوم کی تحریک کے بعد باقاعدہ طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اسی عہد میں یہ نظریہ ایک تحریک کی صورت میں نمایاں ہوا۔ جس کی رو سے انسان کو مرکزِ کائنات قرار دے کر اس کی انفرادی آزادی پر اصرار کیا گیا ہے تاکہ انسان اپنی آزادی کو بروئے کار لا کر اپنی دنیا تعمیر کرے اسے تبدیل کرے اور اس کے ارتقاء کی ذمہ داری اٹھا سکے۔ کیونکہ انسان دوستی ماورائی قوتوں سے انکار کی بناء پر انفرادی اور کائناتی تعمیر وارتقاء کی ذمہ داری فرد کے کندھوں پر ڈالتی ہے۔ انسان دوستی میں فرد کی آزادی اور مساوات کا تصور کسی ایک ملک یا معاشرے تک محدود نہیں ہے بلکہ رنگ و نسل اور زبان و علاقائیت کی تقسیم کو ترک کر کے ایک مثالی معاشرے پر منحصر ہے۔ جہاں ہر انسان عدل و انصاف کے سائے میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر سکے۔ اس نظریے کی رو سے انسانیت کی نشو نما کے لیے امن، عدل اور انصاف ہر ایک کا بنیادی حق ہے۔ یوں انسان دوستی کا فلسفہ انفرادی آزادی کا قائل ہے۔ آزادی کی قدر افزائی در حقیقت انسان دوست مفکرین کا اہم موضوع رہا ہے۔ ان کو ایسی آزادی سے دلچسپی ہے جس کو انسان فطرت اور معاشرے میں بروئے کار لا سکے، کیونکہ آزادی انسان کا بنیادی اور پیدائشی حق ہے۔ جسے وہ اپنی دنیا تعمیر کرنے، اسے بدلنے اور ترقی دینے کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ انسان دوستی کا فلسفہ پوری انسانیت کو آزادی و مساوات کے حقوق عطا کرتے ہوئے انہیں اخوت و بھائی چارے کی لڑی میں پرو دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں انسانوں کی طرف سے رنگ و نسل اور زبان و علاقائیت کی بنیاد پر تیار کی گئی دیواریں زمین بوس ہو جاتی ہیں اور انسان اور انسان کے درمیان غیر فطری امتیازات کی بنیاد پر تفریق و انتشار اور فساد فی الارض کی تمام کوششوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ انسان دوستی کا نظریہ امن کا پیامبر ہے۔ ایسا امن جس میں انسانیت پروان چڑھ رہی ہو اور اسے اندرونی اور بیرونی طور پر کسی فتنہ و فساد کا کوئی خطرہ نہ ہو لوگوں کے حقوق محفوظ ہوں۔ معاشرے میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ کمزور اور زیر دست افراد توانا اور مضبوط ہوں۔ ظالم اور مفسدوں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں۔

اس تناظر میں آفتاب اقبال شمیم کے فکر و فن کے تحقیقی جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے ہاں ابتداء ہی سے ایک ایسا آدرش نمو پا چکا تھا جس کی اساس انسان دوستی کے فلسفے پر استوار ہوئی ہے۔ ہر چند آفتاب اقبال شمیم نے ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ ۱۹۶۰ء کی لسانی تشکیلات کی تحریک سے بھی اثرات قبول کیے ہیں لیکن ہر طرح کے جبر سے آزاد ایک مثالی حیاتِ انسانی کا تصور ان کی نظموں میں ابتداء ہی سے نمایاں رہا ہے۔ جس کی رو سے جبر کے لامتناہی عہد میں انسانی محبت اور آزادی کا خواب ان کی تخلیقات کا اہم وصف بن کر سامنے آتا ہے۔ اس خواب کی تشکیل و تعمیر میں ان کا مثالی

کردار ”زید“ بھی ان کے ساتھ ہے۔ جس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ اپنے اولین مجموعے ”فردانژاد“ کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"زید اور میں خواب دیکھتے ہیں۔ زید وہ فردِ اول یا عنصری انسان ہے۔ جس کی بنیاد پر میں نے اپنی معاشرتی شخصیت کی تعمیر کی ہے۔ ہم دونوں جبر کے شاہی قلعے کے زندانی سرد سلوں پر سوتے ہیں اور دور کے اس شہر کی جانب دیکھتے ہیں جہاں محبت اور آزادی کے مندر میں داسیاں ناچتے ناچتے خود اپنی خوشبو بن جاتی ہیں۔ حسن منکشف ہو کر وصل کی بشارتیں دیتا ہے اور ایک فردِ دگر کی آفرینش گزرے ہوئے حوالوں کو نابود کر دیتی ہے۔" (۳)

فرد کے لیے ہر طرح کے جبر سے آزاد ایک ایسی زندگی جو محبت اور آزادی سے عبارت ہو آفتاب اقبال شمیم کا ایک ایسا خواب ہے جو ان کے اولین مجموعے ”فردانژاد“ سے آخری مجموعے ”ممنوعہ مسافتیں“ تک بے شمار نظموں میں اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ایک ایسے آئیڈیل معاشرے کا خواب جس میں فرد کی فلاح اس کی بے مشروط آزادی کی ضامن بن کر سامنے آئے۔ آفتاب اقبال شمیم کی نظموں کا مرکزی قضیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ چونکہ آفتاب اقبال شمیم کی تخلیقات کا دورانیہ کوئی نصف صدی پر پھیلا ہوا ہے اس لیے عہد بہ عہد تبدیلیوں کے ساتھ جبر کی بدلتی ہوئی شکلوں اور فرد کی آزادی مصلوب کرنے کے نت نئے جابرانہ حربوں کا بیان بھی ان کی نظموں کا نمایاں وصف ہے۔ وہ انسان دوستی کے آدرشی مذہب کے اصول کی راہ میں اٹھائی جانے والی دیواروں سے فرد کو آگاہ ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی گھٹن اور فرد کے حقوق پر غاصبانہ قبضے کے خلاف ایک پر امید احتجاج کی راہ بھی دکھاتے ہیں۔

وہ فرد کا فرد پر جبر ہو یا ملکی و بین الاقوامی جبر کی کوئی صورت ہو، آفتاب اقبال شمیم اسے انسانیت کے حق میں زہرِ قاتل تصور کرتے ہیں اور معاشرے کے پسماندہ اور پسے ہوئے طبقوں کے تمام انسانوں میں شعور و آگہی پیدا کر کے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل و تعمیر کی دردمندانہ آرزومندی کا اظہار کرتے ہیں جس میں ایک عام انسان بھی زندگی کے لذائذ سے بہرہ مند ہو سکے۔ اس حوالے سے آصف ہمایوں لکھتے ہیں۔

'طاقت ور اور کمزور کے مسئلے میں وہ طاقت ور کا اتحادی بننے سے انکار کر دیتا ہے۔ غریب بھی کتنے غریب ہیں کہ اپنے وجود کے خلاف گواہی دے کر چند لوگوں کے وجود کو تسلیم کروانے پر مصر ہیں۔ وہ اس دھندلائی فضا میں خدا کی مخلوق کے درمیان پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اپنا قد بڑھانے کی ہر کوشش کو شرک گردانتا ہے۔" (۴)

اس حوالے سے آفتاب اقبال شمیم عظمت بشر کے قائل ہیں اور انسان کی عظمت پہ کسی بھی طرح کا حملہ انھیں گوارا نہیں۔ انھیں جہاں کہیں ایسی صورت حال دکھائی دیتی ہے جس میں فرد کی زندگی پہ قدغنیں لگائی جا رہی ہوں وہ اس پہ سوال اٹھاتے ہیں اور اسے قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے اولین مجموعے ”فردانژاد“ کا آغاز ہی اس دعا سے ہوتا

ہے جس میں وہ فرد کے لیے کشادگی کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے اس صورت حال کا بیان کرتے ہیں جس میں فرد کو نافرد کر کے اسے اپنی عظمت کو فراموش کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور وہ رفعتوں کے خواب کو بھول کر پستیوں میں گھرا رہنے پر مجبور ہے۔

> "زمین کی تنگیوں کو اپنی بخشش سے کشادہ کر / کہ سجدہ کر سکوں / یہ کیا کہ
> میرے حوصلوں میں رفعتیں ہیں / اور گرتا جا رہا ہوں / اپنی فطرت کے
> نشیبوں میں "(۵)

ایسی صورت حال میں انسان اپنا موازنہ مظاہر فطرت سے کیے بغیر نہیں رہ سکتا اسے محسوس ہوتا ہے کہ مظاہرِ فطرت تقدیر کے پابند ہونے کے باوجود انسان سے کہیں زیادہ آزاد فضاؤں میں سانس لے سکتے ہیں درخت زمین میں پیوست ہوتے ہوئے آسمانوں کی بلندیوں کو چھونے لگتے ہیں پرندوں کے لیے فضائے بسیط ہر وقت ان کی اڑان کی منتظر دکھائی دیتی ہے اور پہاڑ اپنی ہیبتوں کے ساتھ ایستادہ نظر آتے ہیں۔ مظاہرِ فطرت کے ان مشاہدات اور اپنی مجبوریوں کی قید کے موازنے میں انسان کی آخری خواہش ایسی آزادی کی صورت ظہور پذیر ہوتی ہے کہ وہ اپنی ہستی کو ان مظاہرِ فطرت میں بدل دینے کی دعا کرنے لگتا ہے۔ آفتاب اقبال شمیم کے نزدیک انسانی عظمت کا کم سے کم اعزاز یہ تو ہونا چاہیے کہ وہ بلند، کشادہ اور پر شکوہ زندگی کی تعمیر کر سکے بالکل ایسی ہی جیسے فطرت کے مظاہر خاموشی سے آزاد فضاؤں میں تخلیقی اظہار پر قادر ہیں۔

> "خداوندا! مجھے طائر، شجر، پربت بنادے / یا مجھے ڈھا دے / کہ دوبارہ جنم
> لوں اپنی بے مشروط آزادی کی خواہش سے"۔(۶)

دی امریکن ہیومنسٹ ایسوسی ایشن کی تعریف کے مطابق انسان دوستی کا فلسفہ انسان کو فطرت کا حصہ سمجھتا ہے۔ فطرت جو اپنے مظاہر کی نشوونما پر کسی قسم کا جبر روا نہیں رکھتی اسی طرح فطری انداز میں انسان بھی کائنات کا حصہ ہوتے ہوئے معاشرتی سطح پر اپنے حقوق، سماجی انصاف اور تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کی آزادی سے پر امن ماحول میں لطف اندوز ہو سکے۔ اسی تناظر میں آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں جابجا مظاہر فطرت کے حوالے اور ان کی فطری آزادیوں کے انسان کی مجبور زندگی سے موازنے کی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ اس حوالے سے ان کی طویل نظم "درخت" خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ بقول ڈاکٹر سعید احمد:

> "اس مجموعے کی ایک بہت خوبصورت نظم "درخت" ہے جس میں درخت کے امیج کو تجسیم کے عمل سے گزارتے ہوئے علامت بنا کر معنیاتی و جمالیاتی تہہ داری پیدا کی گئی ہے۔۔۔ "درخت" جدید دور کا وہ انسان بھی ہے جو باطن کی گہرائیوں میں زندگی کا اصل جوہر رکھنے کے باوجود استحصالی نظاموں کا زندانی ہے جس کا المیہ یہ ہے کہ درخت کی سی فطری نمود، بلندی اور شوکت اس سے چھن گئی ہے۔"(۷)

اور یہی وہ بنیادی خوبیاں ہیں جن کی بناء پر انسانی عظمت کی عمارت تشکیل پاتی ہے۔ درخت جو کہ انسان کے غیر فطری سلوک کا شکار بھی ہوتا ہے۔ اس پر خزاں بھی آتی ہے۔ اس کی بلند و بالا شاخیں بھی کاٹ دی جاتی ہیں لیکن وہ نمو کے موسموں کا انتظار کرتا ہے اور سازگار موسموں کے آتے ہی وہ ایک بار پھر اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ سرسبز و شاداب ہو کر مسکراتے لگتا ہے۔ سو آفتاب اقبال شمیم اسی سے اس جوہر کی آرزو کرتے دکھائی دیتے ہیں جو فرد کے لیے لازمہ حیات ہے۔

"مجھے بھی یہ شوکتیں عطا کر / مجھے بھی اپنا سا عزم دے دے / مجھے بھی آزادیوں کا، سر کو اٹھائے رکھنے کا بھید سمجھا۔"(۸)

لیکن انسان اس بھید کو سمجھنے اور افق در افق اپنی حدوں کی وسعت کو کھوجنے کے بجائے حالات کی اسیری میں ہمیشہ کا زندانی بن کر اس توانائی سے ہی محروم کر دیا جاتا ہے جو لامتناہی جہانوں کی تخلیق پر اکساتی ہے۔ آفتاب اقبال شمیم ایسے ہمیشہ کے زندانیوں کو اس کرب ناک احساس سے آشنا کروانا چاہتے ہیں جو پنجرے کی قید میں قناعت کا سبق پڑھنے سے پیدا ہوتا ہے اور انسان کبھی کسی ماورائی قوت پر انحصار کر کے کبھی تقدیر پر بھروسہ کر کے قوت بازو کو آزمانے کی صلاحیت سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے اور بالآخر وہ اپنے حقوق اور تمناؤں کی دنیا سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

"چار دیواریاں وسعتوں کے مدور علاقے کی / چو کور نقلیں ہیں کیا؟ / یہ چھتیں آسمانوں کی نقلیں ہیں کیا / یہ نگاہ و تصور کی پرواز، آزادیوں کی ہوس / خاک کی خوش خیالی ہے کیا؟"(۹)

ایک ایسی انسان کش صورت حال، جس کی اسیری فرد کا مقدر بنا دی گئی ہے، میں بھی آفتاب اقبال شمیم قنوطیت کا شکار نظر نہیں آتے پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں ویت نام کی جنگ میں سامراج کے ظلم و ستم نیپام بموں کی صورت برستے ہوں یا تاریخ کے کسی منطقے سے منجنیقیں زمین کی سرسبز و شاداب کوکھ کو برباد کرنے پر تلی ہوں آفتاب اقبال شمیم اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ آخری فتح محروم، مجبور اور مظلوم انسان کی ہو گی۔ یہ گھاس کی طرح پاؤں کے تلے روندے اور مسلے ہوئے انسان آخر کار ایک ایسا خطہ امن حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جہاں ان کی مرادیں بالکل اسی طرح نمو پذیر ہوں گی جیسے روندی اور مسلی ہوئی گھاس زمین کی کوکھ سے پھوٹ نکلتی ہے اسی طرح حالات کے مارے ہوئے یہ لوگ انسانیت کے ماتھے کا جھومر بن کر اس کی رعنائی میں اضافے کا باعث بنیں گے۔

"سبز معصومیوں کو سدا / منجنیق اور نیپام کی نفرتیں بدبوؤں سے شرابور کرتی رہیں / بارہا راکھ بکھری / زمیں پر کئی پیل پیکر زمانوں کے شانے لگے / پر ہمیشہ ہوا یوں / کہ ماں سبز اولاد جنتی رہی / نظم بنتی رہی"(۱۰)

آفتاب اقبال شمیم کے انسان دوستی تصور کی نمود جہاں ان کے گہرے تاریخی شعور کے نتیجے میں عمل پذیر ہوئی ہے وہیں انہوں نے موجود منظر نامے کے مشاہدے سے بھی اس فکر و فلسفے کی روشنی میں اپنی تخلیقات میں جبر اور استحصال کی

کئی صورتوں کی پیکر تراشی کی ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت ۱۹۴۷ء میں ہونے والے خون آشام واقعات جہاں ان کے لاشعور کا حصہ بن کر ان کی نظموں میں انسانیت نواز دردمندی کے ساتھ بیان ہوئے ہیں وہیں انہوں نے نصف صدی سے زائد کو محیط اپنے تخلیقی سفر میں ملکی و بین الاقوامی سطح پر ہونے والے ظلم و بربریت کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ احتجاج و ردِ عمل اور حریت پسندی کی تحریکوں کی حمایت میں تخلیقی اظہار کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ویت نام کی جنگ ہو یا افریقہ کی جنگِ آزادی، عرب اسرائیل کی جنگ ہو یا کشمیر و فلسطین کے نہتے باسیوں پر ظالم و جابر قوتوں کی یلغار یا مشرقِ وسطیٰ و افغانستان پر امریکی حملہ وہ مظلوم اور نہتے انسانوں پر مسلط کی گئی ہر جنگ کے خلاف اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس تناظر میں آفتاب اقبال شمیم کی چند اہم نظموں کا تذکرہ و تجزیہ ان کے انسان دوست رویے کی بہترین عکاسی کا مظہر ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم ان کی طویل نظم "بے انت کا سپنا" ہے۔ جس میں سیاسی منظر نامے کے تناظر میں آفتاب اقبال شمیم نے اپنے نظریاتی اور آدرشی حوالوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔

نظم ڈرامائی ہیئت اختیار کرتے ہوئے مکالماتی صورت میں شاعر کے کرب کا اظہاریہ ہے۔ جس کی رو سے ویت نام کے عوام کی مزاحمتی تحریک امریکی سامراج کے ظلم و ستم، نوآبادیاتی نظام کے پروردہ ستم گروں کی خون آشامی اور ویت نامیوں کے عزم و حوصلے کی داستاں رقم ہوئی ہے۔

> "نظم کا بنیادی قضیہ ویت نام کی تحریک مزاحمت ہے۔ اس تحریک کے حوالے سے سامراج کی چیرہ دستیاں، یورپ کے تاجر پیشہ سفید کرگسوں کی خون آشامی، جلی ہوئی بستیاں، کھنڈرات، خون آلود مناظر اور ویت نامیوں کے عزم و حوصلے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ آدرش کے حصول کے لیے 'نوجوان لڑکوں' کو علامت بنایا گیا ہے جو اپنی جدوجہد میں آخری سانس تک لٹا دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔"(۱۱)

یہی وہ نوجوان لڑکے ہیں جو خون آشام مناظر کے اندھیرے میں امید کی آخری کرن بن کر طلوع ہوتے ہیں۔ بموں کی بارش میں، جلی ہوئی بستیاں انہی نوجوانوں کی راہ تک رہی ہیں جو شاید ہی جنگ سے واپس آ سکیں گے لیکن وہ اپنی زمین کو ظلم کے تسلط سے رہائی دلانے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ ایک ایسی جنگ جس میں طاقت کا توازن کہیں دکھائی نہیں دیتا کمزور کے لیے امید کی روشنی پر اختتام پذیر ہوتی ہوئی یہ نظم جابروں کے لیے عبرت کا پیغام بن کر دلوں پر نقش ہو جاتی ہے۔

> "جوان لڑکو! تمھاری مائیں / جلی ہوئی بستیوں کے ملبے پہ آنسوؤں کی / چمکتی مالائیں لے کے برسوں سے منتظر ہیں / زمیں کو رعشہ سا ہو گیا ہے / تم آؤ گے اور تم نہ آؤ گے اور وہ منتظر رہیں گی / جوان لڑکو! / بموں کی بارش میں آگ کے پیڑ اگ رہے ہیں زمیں کی چھت سے دھوئیں کے جالے لٹک رہے ہیں / بہار کی دلہنیں کہاں ہیں! / سنا ہے وہ بھی / تمھارے ہمراہ آ رہی ہیں۔"(۱۲)

بہار کی یہ نوید اور امید آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں دنیا بھر کے محکوم عوام کی آواز بن کر بار بار سنائی دیتی ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظمیں 'افریقہ۔ اگلے محاذ پر'، 'اعلان نامہ بیروت' بیسویں صدی کے نصف اوّل کے بعد کی بین الاقوامی سیاسی صورت حال کی نمائندگی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان نظموں میں آفتاب اقبال شمیم نے جہاں تیسری دنیا کی آزادی کی جدوجہد میں سرگرداں محکوم عوام کی حریت پسندی کو سراہا ہے اور امن وانصاف اور آزادی کی نعمتوں کو دنیا کے ہر شخص کے لیے لازم قرار دیا ہے وہیں انہوں نے آزادی کی تحریکوں کو کامیابی سے ہمکنار ہونے کی پیشگوئی بھی کی ہے۔ یوں انہوں نے عصری آگہی کے اظہار کے ساتھ ساتھ زندگی کی صورت گری کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں عصر حاضر کے مسائل کا ادراک بھی ہے اور مجموعی انسانی صورتِ حال کا اعتراف بھی۔ اور اس کی تشکیلِ نو کی لگن بھی۔ انسان دوستی کے تناظر میں یہ وصف ایسا ہے جہاں آفتاب اقبال شمیم کی نظم کسی بھی عہد میں روگردانی کرتی نظر نہیں آتی۔

ملکی سطح پر بھی انہوں نے ہر عہد میں سیاسی وسماجی جبریت کا شکار فرد کی حمایت اور جبر کی ہر صورت کی نفی کا روّیہ اپنا کر اپنی تخلیقات میں ایک مزاحمتی رجحان کی مسلسل آبیاری کی ہے۔

۱۹۵۸ء کا مارشل لاء ہو یا ۱۹۷۷ء کا جب جب عوام پر اظہار رائے کی پابندی عائد کی گئی آفتاب اقبال شمیم نے جبر و استبداد کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے انسانی حقوق کی بازیابی کے لیے اپنے قلم کو تلوار بنا کر حقیقی انسان دوست شاعر ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ مزاحمتی شعور کی حامل چند نظموں کے اقتباسات درج ذیل ہیں

> "شہر کے گرداگرد سدھائے فتووں کی دیواریں تھیں / میرے نام پر میرے آگے حائل تھیں / کوہ شمائل دیواریں / جن سے باہر صرف جنازوں کے جانے کا رستہ تھا"(۱۳)

> "ابھی ضرورت ہے / ہم حویلی میں روشنی کو / سکھائیں آداب ظلمتوں کے / ابھی یہ دروازہ بندشوں کا نہیں کھلے گا / ہم اپنے دشمن نہیں کہ معیادِ تربیت میں / خلل کو تسلیم کی سند دیں / یہاں سے جاؤ / یہ چار دیواریوں کا پہرہ / یہ حبس خائف نہیں کسی سے / جمود ہیبت خرابیوں کی / تم اپنے دستِ سبک سے کیسے بدل سکو گی / کہیں سے آندھی کا زور / طوفاں کا غلغلہ اپنے ساتھ لاؤ"(۱۴)

آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں جبر واستبداد کے خلاف احتجاج اور مزاحمت کی لے کسی بھی عہد میں مدھم ہوتی دکھائی دیتی نہیں دیتی۔ جب کبھی جہاں کہیں انسانیت کش قوتیں اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے اپنے ہی جیسے انسانوں کے لیے اسلحے کی طاقت پر زندگی کا قافیہ تنگ کرتے ہیں آفتاب اقبال شمیم اپنی نظم میں نمایاں ہو کر ان کے خلاف صدا بلند کرتے ہیں۔ وہ کمزور اور مظلوم کو زندگی کی جنگ ہار کر بھی جیت سے ہمکنار دیکھتے ہیں کیونکہ زندگی کی مثبت اقدار پر ان کا ایمان مضبوط ہے وہ جانتے ہیں کہ آج اگر ان شکست خوردہ مظلوم قوموں کی ہمت نہ بندھائی گئی تو ظلم کا ہاتھ دراز ہو

جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی امید کا سورج کبھی نہیں گہناتا اور وہ کسی بھی مرحلے پر زندگی کے اثبات سے گریز نہیں کرتے۔ ظلم کی طویل رات کی آگہی سے گریز کرتے ہیں نہ ہی اس کے مسلسل اظہار سے اکتاتے ہیں۔ مزاحمت کی صدا بلند کرنے کا یہ سفر نصف صدی سے زیادہ پر محیط ہے۔ انسان ایک ہزاریے کا سفر مکمل کر کے اکیسویں صدی میں داخل ہو گیا لیکن طاقت ور نے کمزور کو برداشت کرنے کا ہنر نہیں سیکھا۔ سو بیسویں صدی کے آخری دہائی سے اکیسویں صدی کے آغاز تک کبھی بغداد تاراج ہوا اور کبھی افغانستان ڈیزی کٹر بموں کا نشانہ بنا لیکن آفتاب اقبال شمیم ان مظالم کے خلاف بھی اپنی آواز کا پرچم بلند کیے ہر ظلم کی نفی کرتے ہوئے تخلیقی محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ اس تناظر میں ان کا ۲۰۰۴ء میں اشاعت پذیر ہونے والا مجموعہ "میں نظم لکھتا ہوں" انتہائی اہم ہے۔ جس میں "سقوطِ بغداد"، "بیروت"، "امن کے حوالے سے"، "بخت خاں وار کر" اور "نیوکلئیر ہولو کاسٹ" جیسی نظمیں انسانی آزادی اور امن عالم کے حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان نظموں میں آفتاب اقبال شمیم نے امن عالم کو تاراج کرنے والی قوتوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی اور اس کی آسائش پر انسان کا بنیادی حق ہے جسے اگر کوئی طاقت کے بل بوتے پر چھین کر اپنے گھر کے لیے خوشحالیاں خریدنے کا خواب دیکھتا ہے تو اس کی نفی کے لیے چاہے جان بھی کیوں نہ دینی پڑے اس کا انکار ضروری ہے۔ کیونکہ اسی انکار میں زندگی کا اثبات پوشیدہ ہے۔ اور ایسے انکار کی خاطر مرنے والا آئندہ نسلوں کے لیے امید کی کرن بو جاتا ہے۔

"یہ شہر شہروں کا شہر جنگِ مزاحمت کے / محاذ پر ہے / ابھی اٹھے گا / بنام آئندگی اٹھے گا / سیاہ ایام کے ورق پر / لہو میں اپنی گواہیاں درج کرنے والا / نہیں مرے گا یہ مرنے والا"(۱۵)

"بخت خاں وار کر۔۔۔ اجنبی فاتحوں کے ہر اول پہ / یلغار کر / جبر کی ہر کمیں گاہ جن کی حفاظت میں ہے / تیرا انجام ہو گا وہی جو ہوا / پھر بھی اے بخت خاں، اپنے ہونے کا اقرار کر / جیت جا ہار کر"۔(۱۶)

آفات ارضی ہوں یا سماوی جب بھی انسانوں پر ٹوٹتی ہیں آفتاب اقبال شمیم کا دردمند دل دکھی انسانیت کے لیے نوحہ کناں ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر سود وزیاں کے بعد اگر کوئی مخلوق خسارے میں رہتی ہے تو وہ صرف اور صرف انسان ہے۔ جسے اپنے دکھ پر آنسو ہی نہیں بہانے ہوتے بلکہ ان آنسوؤں کو خود ہی پونچھنا بھی ہوتا ہے۔ انسان کے دکھ ایسے ہیں جن کا درماں بھی خود انسان ہی کو کرنا ہوتا ہے۔ یہ کبھی اپنے ہی جیسی مخلوقِ انسانی کے ہاتھوں ستم کا شکار ہوتا ہے اور کبھی آسمان اس پر قہر ڈھاتا ہے ایسے میں دکھ کو ابدی دکھ سمجھ کر بیٹھ رہنا بھی انسان کو زیب نہیں دیتا اور دکھ سے فرار بھی اس کو گوارا نہیں ہوتا۔ دکھوں کو دل سے لگا کر آئندہ کے راستوں کو کھوجنا اور نئے امکانات کی طرف دیکھنا ہی مثبت رویہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آفتاب اقبال شمیم جب بھی انسان کو دکھ میں مبتلا دیکھتے ہیں انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان دکھوں کا مداوا اسی میں ہے کہ انسان کسی ماورائی قوت کی طرف دیکھنے کے بجائے دکھ کا سامنا کرتے ہوئے مستقبل کے امکانات پر نگاہ رکھے۔ کیونکہ وہ قدرت کی بے نیازیوں کو جاننے اور سمجھنے سے قاصر ہے بہتر ہے وہ اس سے اغماض برتتے ہوئے عملی طور پر وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کرے جس سے آنے والی نسل بہرہ مند ہو سکے۔ کیونکہ زندگی کے امکانات موت کے ہاتھوں

ختم نہیں ہوسکتے۔ اس حوالے سے ۲۰۰۵ء کے تباہ کن زلزلے کے تناظر میں ان کی نظم "اے گڑھی حبیب اللہ، خیر تیرے بچوں کی!" خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ جس میں انہوں نے اس المناک سانحے میں لقمہ اجل بننے والے معصوم بچوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہی باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ایسی معصوم روحوں کا ایسے حادثے کا شکار ہونا دیکھنے والے کو گنگ کر دیتا ہے اور وہ خدا کی بے نیازیاں بھی سمجھ نہیں پاتا پھر اس کے دکھ کی چارہ گری کون کرے۔ ان کے نزدیک اس مسئلے کا حل صرف انسان کے پاس ہے کہ وہ اپنی قوت ارادی کے بل پر مستقبل پر نظر جمائے رکھے اور موت سے زندگی کشید کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ خود زندگی کا وتیرہ بھی یہی ہے۔

"زندگی تو طائر ہے / موت کی جھپٹ پر جو / مشتِ پر گنوا کر بھی / کل کی شاخِ امکاں پر / جا کے بیٹھ جاتا ہے"(۱۷)

یہی وجہ ہے کہ ایسی قدرتی آفات کے نتیجے میں ہونے والی تباہی انھیں صدیوں پر پھیلی ہوئی انسانی تاریخ کے تناظر میں زندگی کو سمجھنے دوسروں کو سمجھانے اور یہ باور کرانے پر اکساتی ہے کہ ہر قدرتی آفت چاہے وہ زلزلوں کی صورت میں ہو یاسونامی جیسے طوفانوں اور سیلابوں کی صورت اصل میں صفحۂ ہستی پر نکلی ایسی فال ہے جو ہمیں یہ احساس دلا رہی ہے کہ انسان ہر لمحہ خطرات سے دوچار ہے سو زندگی اور موت کے روبرو کھڑے وہ انسان جو اسلحے کے زور پر اپنی خوشیوں کی دنیا تعمیر کرنا چاہتے ہیں وہ اس عمل سے باز آجائیں

"دو معیادوں کے یہ رہبر / آتش و آہن کے سوداگر / اپنے سگان خواہش کو زنجیر کریں / ایک مساوی دنیا کی تعمیر کریں / اپنے اپنے قبضے چھوڑیں، دل تسخیر کریں"(۱۸)

اور اگر دیکھا جائے تو اپنے اپنے قبضے چھوڑ کر ایک مساوی دنیا کی تعمیر اور ملکوں کی بجائے دلوں کی تسخیر ہی انسان دوستی کے فلسفے کا مرکزی نکتہ ہے جو آفتاب اقبال شمیم کی نظم "طاق، چراغ اور بجھتی آنکھ" میں نہایت واضح انداز میں بیان ہوا ہے۔

پوسٹ انڈسٹریل عہد میں صارف کلچر، فری مارکیٹ اکانومی اور میڈیا کی یلغار کے ذریعے انسانی غلامی اور جبر کے انداز بھی تبدیل ہوتے گئے۔ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں اور اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ساتھ ہی فرد کو ایک ایسی صورتِحال کا سامنا کرنا پڑا جس میں اسے خبر ہی نہیں ہوتی کہ بظاہر اس کے آزادانہ فیصلے بھی دراصل اتنے آزاد نہیں۔ بلکہ اسے میڈیا کے ذریعے غیر محسوس انداز میں اس کی مرضی کے خلاف غیر ضروری اشیاء کا خریدار ہی نہیں بنا دیا گیا بلکہ حد تو یہ ہے کہ خود انسان بھی ایک شے بن کر رہ گیا ہے۔ معاشی عالم گیریت کے نتیجے میں حس و ادراک کی یہ دنیا محض ایک تجارت گاہ بن کر رہ گئی ہے۔ جہاں جذبہ و احساس خیال، تصورات اور عقائد تک شے میں ڈھال کر فروخت کیے جا رہے ہیں۔ یوں انسان کی انفرادی آزادی ہی ختم ہو کر نہیں رہ گئی بلکہ وہ اپنے آزاد فیصلوں میں بھی میڈیا کا مرہونِ منت ہو کر رہ گیا ہے۔ آفتاب اقبال شمیم نے انسان کو جنس سوداگری میں تبدیل کرنے کے خلاف بھرپور انداز میں آواز اٹھائی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "زمانہ بازار بن گیا ہے" انتہائی اہم ہے۔ یہ نظم چار حصوں یا چار مختلف نظموں پر مشتمل ایک نسبتاً طویل نظم قرار دی

جاسکتی ہے۔"زمانہ بازار بن گیا ہے" ان کے چوتھے شعری مجموعے "میں نظم لکھتا ہوں" میں شامل ہے جب کہ اس سلسلے کی چوتھی نظم ان کے آخری مجموعہ نظم "ممنوعہ مسافتیں" میں شامل ہے۔"زمانہ بازار بن گیا ہے" میں آفتاب اقبال شمیم نے صارفیت اور میڈیائی یلغار کے نتیجے میں پیدا ہونے والے منافقت کے "ماس کلچر" اور اس کی کامیابی کے لیے اسلحے کے زور پر عالمی دہشت گردی کی قلعی کھولی ہے۔

"عجیب دہشت میں آسماں ہے / جگہ جگہ خاک کے بدن سے لہو رواں ہے / تو کیا یہی ہے خدا کی بستی / جہاں معیشت کی بیڑیوں میں بندھی ہوئی / خلقتوں کی منڈی لگی ہوئی ہے / جگہ جگہ اسلحے کی نسلیں فروغ میں ہیں"(۱۹)

اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ معیشت کی بیڑیوں میں بندھا ہوا انسان اپنی انا کی دولت بھی کھو چکا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ معاشی عالم گیریت کے ہتھکنڈوں کے جال سے خود کو رہائی دلانے کی کوشش ضرور کرتا۔یہی وجہ ہے کہ اس صورت حال کے تخلیق کرنے والے یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آدمی غیب کا صحیفہ ہے کوئی جنس سوداگری نہیں ہے بقول ڈاکٹر سعادت سعید:

"انسانوں کا نیلام۔۔۔فرد کی بے اطمینانی، ہم ذات کا ہر نسل کے ساتھ مرنا اور جینا، ناقابلِ تعبیر خوابوں سے خجل ہونا۔۔۔ ہلاکت آفرینیاں، نابیناؤں کی لکھی ہوئی شرائط میں زندگی کرنا فتوؤں کی آڑ میں انسان کشی، آمریت، موت، نسلی بُعد۔۔۔اور اسی نوع کے ان گنت موضوعات آفتاب کی نظموں کا حصہ بنے ہیں"(۲۰)

اس عہد کے فرد کے لیے آفتاب اقبال شمیم کا ناقابلِ تعبیر خواب صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ زمین کا مطلق فرماں روا کسی طرح یہ بات سمجھ جائے کہ زندگی کے تمام مظاہر عدل و امن کی میزان میں ایسے تلے ہوئے ہیں کہ انسان کو پامال کرتی ہوئی وقتی فتوحات کوئی معنی نہیں رکھتیں اس لیے انسانیت کو پسِ پشت ڈال کر کوئی مادی کامیابی حاصل کرنا کوئی کامیابی نہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ اس راز کو سمجھا جائے کہ انسان منشائے غیب کا ایک ایسا آئینہ ہے جسے اگر چُور ہونے سے نہ بچایا گیا تو اس سے بڑی ہزیمت کوئی اور نہ ہوگی۔

"کہ آج کے دور کا سکندر / نہیں سمجھتا کہ آدمی غیب کا صحیفہ ہے / جنس سوداگری نہیں ہے / نہیں سمجھتا کہ ہاتھ اس کا قضا کی تلوار بن گیا ہے / زمانہ بازار بن گیا ہے"(۲۱)

یوں دیکھا جائے تو آفتاب اقبال شمیم کی نظمیں عہد بہ عہد انسانی حقوق، عزت وآبرو اور عظمت کی ایسی داستان سناتی ہیں جو وقت کے کسی ایک منطقے تک محدود نہیں بلکہ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ جن نت نئے طریقوں سے انسانی آزادی اور مساوات کے خواب کو پامال کیا گیا ہے ان سب کی احتجاج آمیز آگاہی کا فرض بھی نبھا رہی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔Robert p Gwinn. Encyclopedia Britannica. Vol 20, Chicago. U.S.A. 1962. p665

۲۔ رالف مارٹن، آدمی کی انسانیت، محمد بخش سلیم، مولانا(مترجم)مقبول اکیڈمی لاہور، اشاعت دوم ۱۹۴۴، ص۷

۳۔ آفتاب اقبال شمیم، فردانژاد، مشمولہ نادریافتہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۶، ص۸

۴۔ آصف ہمایوں، مشمولہ مجلہ " دستاویز" شمارہ ۷، ۶، قاضی پرنٹرز، راولپنڈی، جلد دوم ۱۹۹۱، ص ۹۸

۵۔ آفتاب اقبال شمیم، آدم زاد کی دعا، فردانژاد، مشمولہ نادریافتہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۶، ص ۲۵

۶۔ آفتاب اقبال شمیم، آدم زاد کی دعا، فردانژاد، مشمولہ نادریافتہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۶، ص ۲۶

۷۔ سعید احمد، ڈاکٹر، "نادریافتہ فردانژاد"، مشمولہ نادریافتہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۶، ص ۱۰

۸۔ آفتاب اقبال شمیم، درخت، زید سے مکالمہ، مشمولہ نادریافتہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۶، ص ۲۲۲

۹۔ آفتاب اقبال شمیم، اے ہمیشہ کے زندانیوں، گم سمندر،، مشمولہ نادریافتہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۶، ص ۳۵۷

۱۰۔ آفتاب اقبال شمیم، ہم، فردانژاد، مشمولہ نادریافتہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۶، ص ۷۰

۱۱۔ سعید احمد، ڈاکٹر، نادریافتہ،، مشمولہ نادریافتہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۶، ص ۹

۱۲۔ آفتاب اقبال شمیم، بے انت کا سپنا، زید سے مکالمہ،، مشمولہ نادریافتہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۶، ص ۲۰۳

۱۳۔ آفتاب اقبال شمیم، میں کیا کرتا، فردانژاد،، مشمولہ نادریافتہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۶، ص ۱۰۲

۱۴۔ آفتاب اقبال شمیم، جس کی خراب گاہ سے، فردا نژاد، ، مشمولہ نا درےافتہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۶، ص ۱۴۹

۱۵۔ آفتاب اقبال شمیم، سقوطِ بغداد، میں نظم لکھتا ہوں،، مشمولہ نادریافتہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۶، ص ۶۳۵

۱۶۔ آفتاب اقبال شمیم، بخت خاں وار! ، میں نظم لکھتا ہوں، ، مشمولہ نادریافتہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۶، ص ۶۶۲

۱۷۔ آفتاب اقبال شمیم، اے گڑھی حبیب اللہ خیر تیرے بچوں کی، "میں نظم لکھتا ہوں"، مشمولہ نادریافتہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۶، ص ۶۳۷

۱۸۔ آفتاب اقبال شمیم، طاق چراغ اور بجھتی آنکھ، "میں نظم لکھتا ہوں" ، مشمولہ نادریافتہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۶، ص ۵۷۴

۱۹۔ آفتاب اقبال شمیم، زمانہ بازار بن گیا، مشمولہ نادریافتہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۶، ص ۵۷۷

۲۰۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، فن اور خالق، دستاویز مطبوعات لاہور، اشاعت اول ۱۹۹۸، ص ۷۷

۲۱۔ آفتاب اقبال شمیم، زمانہ بازار بن گیا، میں نظم لکھتا ہوں ، مشمولہ نادریافتہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۶، ص ۵۷۹